

علم کا اک چراغ تھا نہ رہا مورخ محقق، مصنف، صحافی اور مشہور عالم مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

نور عالم خلیل اہنی مدیر رسالہ "الداعی" عربی و اساتذہ عربی دارالعلوم دیوبند

کئی ماہ سے، مبارک پور اور دیارِ اُٹم گزشتہ سے آنے والوں کے ذریعے، مسلسل یہ خبر ملتی رہی کہ مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری ریٹائریشن پر فراش ہیں۔ انھیں ناک میں کوئی تکلیف تھی جس کا آپریشن کرایا تھا۔ آپریشن کی وجہ سے نقابست و اضطراب پیدا ہو گیا جو عرصے تک انھیں اپنی گرفت میں لئے رہا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ صحت یاب ہو گئے ہیں۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد خبر آئی کی وہ بخار وغیرہ میں مبتلا ہیں، کمزوری کافی بڑھی ہوئی ہے۔ تاہم کہ یہ خبر سماعۃ اثر سنسنے کو ملی کہ تحقیق و مطالعہ تصنیف و تالیف، صحافت نو تدریس اور تعلقات عرب و ہند کے صحرائے ناپیدا کنار کارہی پر شوق بلکہ مجنون حوصلہ بدوش، شب دوشنبہ، 1417/2/28 ھ مطابق 1996/7/15ء کو ٹھیک 9 بج کر 55 منٹ پر دارفانی سے، جو ہم سبھی انسانوں کی سرائے ہے، دارِ آخرت کو جو ہم سبھوں کا آخری ٹھکانا ہے، سداہ گئے ان اللہ و ان اللہ راجعون۔

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے نہ صرف ہر صغیر بلکہ اسلامی دنیا کے کثیر التالیف اہل تحقیق مورخوں کی صف میں ایسا غلا پیدا ہو گیا ہے، جس کا اس دورِ قحط الرجال میں، بظاہر حال پر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ خدا نے قدیر ہر چیز پر قادر ہے لیکن عرصے سے یہی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ میدانِ علم و عمل اور فضل و کمال کا جو یکتا سے روزگار بھی رخصت ہو جاتا ہے، اس کی جگہ خالی ہی پڑی رہ جاتی ہے۔ بالآخر "کام چلاؤ" پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

قاضی صاحب نے، طویل و صبر آرا مطالعے پر مبنی گراں مایہ تصنیفات سے اسلامی کتب خانے کو مالا مال کیا اور عرب و ہند کے تعلقات دیرینہ کے اچھوتے موضوع پر تفصیل، دقت رسی اور جامعیت کے ساتھ عمدہ بہمد کام کیا، ہزاروں صفحات پڑھے اور چوٹی کے منہ سے شکر جمع کرنے کے عمل کے ذریعے کئی عدد ضخیم کتابیں اردو اور عربی دونوں زبانوں میں تصنیف حقیقت یہ ہے۔ کہ ان کا یہ کام علمی دنیا پر رہتی دنیا تک کے لیے لائق ہزار شکر احسان ہے۔ جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی دیوبندی دہلوی موتوی 1404، مطابق 1984ء، جنھوں نے اپنے ”ندوة المصنفین“ دہلی سے قاضی صاحب کی اہم ترین تاریخی کتابوں کو خصوصی دلچسپی کے ساتھ شائع کیا تھا، خلافت عباسیہ اور ہندوستان“ کے پیش لفظ میں، بہت ہی خوب صورت اور معنی ریز جملوں میں قاضی صاحب کی محنت اور اتھک تلاش و تحقیق کی داد دی اور لکھا کہ ”اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب اس بے آب و گیاہ صحرائیں تنہا چلے اور جب لوٹے تو باغ و بہار کا پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے۔“

ان کا یہ تاریخی سلسلہ، جس میں ”عرب و ہند عہد رسالت میں“ ”خلافت راشدہ اور ہندوستان“ ”خلافت امویہ اور ہندوستان“ ”خلافت عباسیہ اور ہندوستان“ اور ”ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں“ سرفہرست ہیں، بہت مقبول ہوا اور اردو و عربی دونوں زبانوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

تحقیق و مطالعہ طلب اور شب و روز کی محنت کی متقاضی تاریخی و اکیڈمک تصانیف کی تالیف قاضی صاحب کی شناخت بن گئی تھی۔ وہ سرسری مضامین لکھنے پر قادر نہ تھے کیوں کہ وہ سطحی تالیفات و نگارشات کی آلودگیوں سے پاک دامن ہندوستانی مولفین کے قافلہ قابل رشک کی باقیات میں سے تھے۔ اسی وجہ سے اسنی بے سرو سامانی سادگی۔ شہرت سے دامن کشی اور کاروان نمرہ زن سے بیگانہ رہنے کے باوجود۔ عالم گیر شہرت نے ان کے قدم چومے اور ہمہ گیر نیک نامی نے ان کی بلائیں لیں۔ بالخصوص عرب دنیا میں وہ بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے دین و ملت، جس کے وہ ایک قابل اقتدار فرزند تھے، کے ساتھ ساتھ اپنے اس ملک کے لیے بھی نیک نامی کا ذریعہ بنے جواب مسلمانوں کے تئیں ناٹھری کی تمام حدیں بھلانگنے پر تیار ہوا ہے۔

قاضی اطہر مبارک پوری اس بات کی تاباک مثال تھے کہ انسان اپنے آپ کو تنگدستی و عسرت کے باوجود اور ”بھوٹی جگہ“ رہ کر اپنی محنت و جہاں فشانہ اور بلند ہمتی کے ذریعے قابل رشک حد تک بڑا سنا سکتا ہے۔ انھوں نے حقیقی بڑائی، پائدار نام و ری اور قابل قدر مقام و مرتبہ کے عناصر مطلوبہ، اپنے چھوٹے سے گم نام مدرسے بنام احیاء العلوم مبارک پور اور اپنے محدود ماحول والے ایسے قصبے میں حاصل کر لیے جو مروجہ ممنوم میں ”تہذیب و تمدن کی روشنی“ سے محروم کسی ایسی قابل ذکر علمی و ثقافتی سرگرمی سے نا آشنا تھا، جو عالم اسلام کے علمی پایہ تختوں کا امتیاز رہا ہے۔ جیسے حجاز۔ دمشق، قاہرہ، بغداد فارس، رباط، وہبی اور دیوبند وغیرہ۔ مکتبہ کے مرحلے سے اعلیٰ تعلیم تک کے تمام مراحل انھوں نے اسی قصبے میں طے کیے۔ صرف ایک سال مدرسہ شاہی مراد آباد میں گذارا جہاں دوہ حدیث شریف میں

شرکت کی اور سند فراغ حاصل کیا۔

وہ خود فرماتے ہیں۔

”میرے محدود وسائل اور مخصوص حالات، قرب و جوار کے بڑے مدرسوں میں جانے کے حق میں بالکل نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے صرف ایک سال باہر رہنا نصیب ہوا۔ اس کے باوجود حوصلے کی بندی اور تحصیل علم کی جہن کا حال یہ تھا کہ جامعہ ازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سودا ہر وقت سر میں سمایا رہتا تھا، بلکہ بعد میں، بھی یہ آرزو باقی رہی۔ مگر میں نے اپنے ذوق و شوق کی بدولت ناکامی کو کامیابی سے یوں بدل دیا کہ اپنے گھر اور مدرسے کو جامعہ ازہر، جامعہ زیتونہ، جامعہ قرطبہ، مدرسہ مستصریہ بنالیا اور وطن ہی میں رہ کر خدا کے فضل و کرم اساتذہ کی شفقت و محبت اور اپنی محنت و عزیمت سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اس دور میں مجھ پر عجیب علمی سرستی اور شوریدگی چھائی رہتی تھی۔ ہر وقت بغداد و بخارا، اندلس و غرناطہ اور عالم اسلام کی قدیم مشہور درس گاہوں اور ان کے اساتذہ و تلامذہ کے مناظر سامنے رہتے تھے اور میں ان کی حسرت و برکات سے متفحص ہوتا رہتا تھا“ (قائدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک ”از قاضی الطرمہ مبارک پوری ص 11، 18)

قاضی صاحب کا نام و فضل اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ علم و ثقافت اور فکر و دعوت کے میدان میں قبولِ ذریعہ بردار کرنے اور جبین تاریخ پر نقش دوام چھوڑ جانے کے لائق بننے کے لیے انسان کو کتنے وسائل و بائیں تہمتیں اٹھانا پڑتی ہیں، جتنا کہ خود اس کی ہمت و حوصلہ اور مطلوبہ محنت کی توفیق ان اور برکت ربانی کی ہمیشہ نے منور کر دیا ہو۔

”کائنات میں ہمارے ان نوجوانوں کے لیے سامانِ درس موجود ہے جو اپنے آپ کو بنانے کے حوالے سے تنہا، کم کوشی کو تہ طلبی، طاقت نا اندیشی اور حاصل شدہ موقع، وقت، جگہ اور شخصیت کی تمام تر نا قدری کے ساتھ، صرف ”توب سے خوب تر“ جگہ اور وسائل فراوان لو پائینے کی آرزو اور لوشش میں نمرغیز اور وقت گراں مایہ کا ایک ایسا حصہ ضائع کر دیتے ہیں جس میں یک سوئی، اولو العزمی اور صبر و قناعت کے ساتھ ہنرمندی کے ذریعے بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ سچ ہے کہ اگر انسان ذوق طلب اور شوق جستجو سے محروم ہو تو آبِ حیات کے چشمہ بے پناہ پر پہنچ کر بھی تشنہ کام ہی واپس آجاتا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی ذرا سی عمر کے دورانیے میں بہت سے مذکورہ قسم کے ”تشنہ کاموں“ کا مشاہدہ کیا ہے اور کر رہا ہے۔

اس حقیقت کا بیان خود قاضی صاحب کی زبان سے سنئے۔

”طالب علم میں محنت اور کوشش کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ذوق شوق ہو، تو چھوٹی جگہ رہ کر بڑا بن سکتا ہے اور اگر یہ باتیں نہ ہوں تو بڑی جگہ رہ کر پھنسا ہی رہے گا۔ مجھے کسی بڑے علمی و تحقیقی اور تربیتی ادارے کی ہونک نہیں لگی، نہ کسی بڑی شخصیت کی رہنمائی حاصل ہو سکی، ساتھ ہی میرے ذہنی اور خائمی حالات بھی سازگار نہیں تھے، اس کے باوجود میں مطمئن اور خوش ہوں کہ اپنے

ذوق و شوق، محنت و حوصلہ اور خود سازی کے بل پر وہ سب کچھ حاصل کیا جو بڑے اداروں اور بڑی شخصیتوں کی سرپرستی میں رہ کر حاصل کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہوتا بھی ہے۔ کہ مجھے کسی بڑی شخصیت یا ادارے کے سایے میں جگہ ملتی تو میرا علمی پودا قوت نموسے محروم ہو جاتا اور کھلی آب و ہوا میں اسے آزادانہ پھلنے پھولنے اور بار آور ہونے کا موقع میسر نہ آتا۔

1972ء میں پہلی مرتبہ ان لکچرٹوں میں شرف ملاقات و تعارف حاصل ہوا۔ وہ مجھ سے یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ میں بھی مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی متوفی 1395ھ / 1975ء کا شاگرد ہوں۔ قاضی صاحب بچوں کو بے حد خوردنواز تھے۔ اس لیے یہ سنتے ہی مجھے گلے لگالیا کہ تم میرے استاد بھائی نکلتے۔

ان سے دوسری ملاقات دارالعلوم دیوبند کے تاریخی اور بے مثال اجلاس عہد سال (منعقدہ 1400ھ / 1980ء) کے موقع سے اچانک ایک روز صدر گیٹ پر معشر نما بھیڑ میں ہوئی۔ دیکھتے ہی پہچان لگے اور علیک سلیک کے بعد ایک طرف کو کھڑے ہو کر اپنے ہم سفر دو صاحب زادوں کا تعارف کرایا کہ یہ دونوں دارالعلوم سے بھی فارغ ہیں اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے بھی۔ میں بے حد متاثر ہوا ان کی اس یادداشت سے کم کہ وہ آٹھ نو سال کے بعد بھی مجھے اپنے خانہ خیال میں محفوظ رکھے ہوئے تھے کہ انھیں مجھ کو پہچان لینے میں ذرا بھی تکلف نہ ہوا، لیکن ان کے اخلاق کریمانہ سے زیادہ کہ وہ اس بھیڑ میں دیکھتے ہی شفقت سے لپٹ گئے، ورنہ ان سے بہت کم درجے کے لوگ اپنی "علمی ساکھ" کا رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لیے عموماً مچھوٹوں کو پہچان کر بھی طرح دے جاتے ہیں اور اگر از خود پیش رفت کر کے تعارف کرائے تو تجاہل عارفانہ کے ذریعے اپنی کھوکھی عظمت کو جلا بخشنے کی کوشش سے نہیں چوکتے۔

پھر دیوبند میں ان سے بار بار ملنے کی سعادت حاصل رہی جہاں وہ رسمی اور غیر رسمی طور پر سال میں ایک سے زائد بار تشریف لاتے رہتے تھے کہ انھیں ہندی ملت اسلامیہ کی مذہبی زندگی کے عنوان دارالعلوم دیوبند سے (وہاں سے رسمی طور پر فارغ نہ ہونے کے باوجود) ایسی محبت و عقیدت تھی جو بعض دفعہ یہاں کے براہ راست فاضل کو بھی نہیں ہوا کرتی، دارالعلوم دیوبند بھی ان کے ساتھ اپنے فاضل باکمال ہی کی طرح عزت و احترام کا معاملہ کرتا تھا۔

ادھر آخری کئی سالوں سے شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کی اعزازی سرپرستی قبول کرنے کے بعد یہاں ان کی آمد و رفت یقینی بن گئی تھی، لیکن علالت میہم کے باعث قریباً ڈیڑھ سال سے دارالعلوم تشریف نہیں لاسکے تھے۔ ہم اساتذہ کو انتظار ہی رہا کہ وہ اب آئیں گے اور تب لیکن وہ خود یہاں نہ آسکے بلکہ عالم جاوید کو چلے جانے کی ان کی خبر آئی اور ہم سبھوں کو اداس و دل فگار کر گئی۔ میدان تحقیق و تصنیف و صحافت میں ان کا شہرہ میرے کانوں سے طالب علمی کی صغیر السنی ہی آگرایا تھا اور میرے کان، میری آنکھوں سے پہلے ان کا عاشق ہو گئے تھے کہ "الاذن تعشق

قبل العین احیاناً "لبا اوقات آنکھوں سے پہلے کان عاشق: بویہ کرتے ہیں۔ ملاقات کے بعد آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس کے متعلق خدا کو حاضر و ناظر جان کر گوی دی جاسکتی ہے کہ وہ کانوں کے سنے ہوئے سے فزوں تر تھا اور عربی کے مندرجہ ذیل شعرہ آفاق اشعار کا مصداق۔

لقد كانت محادثة الركب ان تنخبرنا عن جعفر بن فلاح اطيب الخبير
فلما التفتينا فلا والله ما سمعت اذنى باحسن مما قد راى بسرى

یعنی آنے جانے والے قافلوں کے ذریعے جعفر بن فلاح کی مسرت بخش خبریں ملا کرتی تھیں۔ جب ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو خدا جانتا ہے کہ کانوں نے (پہلے) اس سے بہتر نہیں سنا جو کہ آنکھوں نے (بعد میں) مشاہدہ کیا۔

لیکن بہت سے "جعفر بن فلاح" ایسے ہیں کہ ان کے متعلق جو کچھ دور سے سنا جاتا ہے، قریب کا مشاہدہ اس کی یکسر تکذیب کر دیتا ہے۔

قاضی صاحب کے متعلق میں نے اپنا یہ تاثر بطور خاص اس لیے ریکارڈ کر دیا ہے کہ بعض دفن بڑوں کے متعلق دور سے سنے ہوئے آواز سے پیدا شدہ اعتقاد کو قریب کا تجربہ سمجھا کر دیتا ہے اور زبان حال و قال سے کہنا پڑتا ہے کہ "ان تسمع بالسمع خیر من ان تراء" یعنی دور کے پھول سہانے ہوا کرتے ہیں۔

قاضی صاحب کو دیکھ کر ان کے بہرے مہرے سے علم و فکر کی بوباس اور ان کے خد و خال سے طویل تحقیق و مطالعے کا سراغ مل جاتا تھا۔ اللہ نے انہیں طالب علم پیدا کیا تھا۔ میں جب بھی یہاں دارالعلوم کے ممان خانے میں ان کے کمرے میں داخل ہوا، میں نے انہیں کچھ پڑھتے یا کچھ لکھتے ہونے پایا۔

وہ، تکلف، تسنّع اور بناوٹ سے ہر زاویے سے پاک تھے۔ لباس و پوشاک، رہن سہن اور زندگی کے تمام شعبوں میں انہیں تسنّع سے نفرت تھی۔ وہ تحریر و تصنیف میں بھی تکلف سے بری تھے، اسی لیے ان کی تحریر میں بے ساختگی، سلاست، اختصار قدرتی باغ کا جمال، خود رسب سے کی ہمارا، راست تعمیر کی شیرینی اور آسان پسندی کی نمکینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ عہد حاضر کے قلم کاروں کی طرح، ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کی روش پر چل کر، معانی سے زیادہ عبارت کی طولانی الفاظ کے اسراف بے جا اور ان کے بناؤ سکار پر توجہ نہیں دیتے تھے، بلکہ وہ جو کچھ لکھتے تھے گوداتی گودا ہوتا، ہوتا، جھکا کا تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

لوگوں سے ملنے جلنے اور بات چیت میں، بھی بے تعف نے ان سے پہلی ملاقات بھی پرانی اور بار بار کی ملاقات معلوم ہوتی تھی۔ ہر ملنے والے کو دیا لگتا کہ برسوں سے ان سے جان پہچان ہے۔ بلکہ وہ اس کو اس کے بزرگ خان دان یا فرخان دان محسوس ہوتے۔ اپنی بے ساختہ گفتگو، شیریں کلامی، سادگی، مہر آمیز برتاؤ شفقت شعاری اور انسیت و ہر قسم سے ملنے جلنے والوں میں گھر کر جاتے تھے۔ وہ

علمائے قدیم کی مبارک نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کا شعار قناعت پسندی ہوا کرتا تھا، چنانچہ زندگی کے کسی دور میں مادیت کی دل فریبی نے انہیں مسور نہیں کیا۔

بمبئی ایسے رنگ و نور کے شہر اور دولت و ثروت کی ریل پیل والے ماحول میں بلکہ آسائش حیات کے ماحول میں رہ کر بھی اپنے دامن علم کو تر ہونے سے بچانے رکھا اور ایک سوئی کے ساتھ داد تحقیق دینے والے بے مثال تصنیفات کی تیاری اور علمی مشاغل میں اپنے کو منہمک کیے رکھا۔ ان کی اکثر اہم تصانیف اسی شہر پر شور میں ان کے قلم سے ڈھلے۔
قاضی صاحب خود فرماتے ہیں۔

بمبئی جیسے شہر میں مدت دراز تک رہنے کے باوجود میں بمبئی والا بالکل نہیں بن سکا۔ بڑی بڑی عقیدت مندانہ پیش کش کو شکرے کے ساتھ واپس کر دیا۔ تعلق، چاہلوسی اور خوشامد سے نفرت رہی اور مدرسے کی فضا میں جو ذہن و روح تھی وہ اس شہر کی رنگینی اور دولت کی نذر نہ ہوسکا اور الحمد للہ کہ میں نے اس شہر کے ایک معمولی کمرے میں بیٹھ کر وہ کام کیا جو بڑی بڑی تنہا ہوں پر علمی اور تصنیفی و تالیفی اداروں میں کیا جاتا ہے اور اس سے دولت کمائی جاتی ہے۔
دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

تیس سال سے زائد مدت تک بمبئی میں مستقل قیام رہا اور جس شہر میں شبلی مرحوم "کنز" آپ چوٹی و گل گشت اپالو" کی سیر کر کے غزل کہا لرتے تھے ان کے ایک ہم وطن نے ایک معمولی سے کمرے میں "مرکز علمی" کالور ڈنگا کر تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری اور مقالہ نویسی کا دور شباب گذارا۔ میں نے بڑے بڑے عقیدت مندوں کی عقیدت اور بڑی بڑی پیش کش کرنے والوں کی پیش کش کا شکریہ ادا کر کے شہر کی ہمک دمک میں کھوجانے کے مقابلے میں بور یہ نشینی کو ترجیح دی۔ میرے یہی خواہ اور مخلص بزرگ و احباب اس معاملے میں مجھے احمق سمجھتے تھے اور میں کم از کم اس بارے میں اپنے کو عقل مند سمجھتا تھا، بلکہ اب بھی سمجھتا ہوں۔

"بمبئی غریب پرور ہونے کے ساتھ ساتھ علم کش شہر ہے جس کا احساس مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی تھا، اس لیے میں نے دولت و ثروت کے اس اندرون قعر دریا "میں تیس سال سے زائد" تحت بند" ہونے کے باوجود اپنے دامن علم کو تر نہیں ہونے دیا اور مختلف قسم کی مصروفیات کے باوجود عرب و ہند کے ابتدائی چار سو سالہ تعلقات پر عربی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھ کر ایک بڑے خلا کو پُر کیا۔"

اب نئی نسل کو کس طرح سمجھایا جائے کہ قناعت کتنی بڑی دولت ہے بلکہ عید دوسرے۔ کہ اس کے ہوتے ہوئے انسان ہر وقت بہرہ مند اور ہر حال میں دولت مند ہے اور اس سے غریبی ہونے کی صورت میں خزانہ قارون اور دولت فرعون و نرود کی فراوانی کے باوجود مفلس بے مایہ ہے۔ عربی کے شاعر نے کتنی سچی بات کہہ دی ہے۔

ما کل ما فوق البسیطة کافیا فاذا قنعت فکل شیء کافی

یعنی اگر انسان قناعت پسند ہے تو کوئی بھی چیز اس کے لیے کافی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر روے زمین کی تمام چیزیں اس کے لیے ناکافی ہیں۔

قناعت کے ہتھیار کے ذریعے دنیا کے تمام مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے، بلکہ قناعت پیڑا افراد کے نزدیک دنیا کا کوئی "مسئلہ" مسئلہ نہیں ہوتا، اسی لیے وہ تمام مسائل اور الجھنوں سے یک سو ہو کر صرف اپنے اپنے عظیم اور شریفانہ مقاصد کو بروئے کار لانے میں جت جاتے ہیں اور ایسے ہی افراد کی مساعی جمید کے نتیجے میں انسانی برادری کو سعادت و سرخ روئی اور فلاح و بہبود کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ دور آخر میں ہمارے اکابر دیوبند بھی قناعت کی مثال تھے۔ ان کی قناعت کے قلعے کو منعمان دہر اپنی کسی کوشش کے ذریعے فتح نہ کر سکے اور ان خدا مستوں کی زبان حال، سرخ روئی سے یہ شعر پڑھتی رہی۔

اپنی سی چال چل کے رہے منعمان دہر مٹھی نہ کھل سکی مرے دست سوال کی

اسی قناعت پسندی اور فقر شنویر کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند اور اس کی جدوجہد کی شکل میں برصغیر میں اسلامی نشات ثانیہ کی طاقت اور تحریک کی بنیاد پر استوار کی کہ اس کا شجرہ طوبی روزاول سے تاجنوز سرسبز و شاداب ہے اور کسی بھی موسم میں برگ و بار لانے میں کوتاہی نہیں کرتا۔

قاضی صاحب نے قناعت کا درس بچپن ہی سے لینا شروع کر دیا تھا، اپنے گھر میں اور اپنے معاشرے میں جس میں اس وقت لوگ قناعت پسندی و کفایت شعاری اور سادگی کی فطرت پر جنم لیتے تھے اور ان عناصر سے مرکب زندگی جینے میں ایسی راحت و سکون محسوس کرتے تھے، جواب وسائل زندگی سے بھرے پرے اس دور میں کسی انسان کو نصیب نہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"طالب علمی کا پورا دور عسرت اور تنگ دستی میں گذرا۔ کھانے، پینے اور پہننے میں کفایت شعاری اور سادگی ہی رہی۔ اس وقت آج کل کی طرح معاش و معیشت میں فراوانی و فراخی نہیں تھی۔ عام طور پر لوگ روکھی پھیکھی زندگی کے عادی تھے اس لیے تنگ دستی اور غربت کا احساس نہیں تھا۔ بلکہ سب لوگ اسی زندگی پر راضی و خوش رہا کرتے تھے۔ اس میں بڑی خیر و برکت تھی۔ میں ہر معاملے میں اپنے ذوق و شوق کے مطابق سامان مہیا کر لیا کرتا تھا اور کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوا۔

قاضی صاحب "علم کے سچے عاشق تھے۔ انھیں جھوٹی شہرت اور وقتی نام وری سے بے پرواہ رہ کر علم میں مشقت آمیز و صبر آدما سفر دراز میں بے پناہ لذت ملتی تھی۔ افسوس ہے کہ نسل نو اس لذت سے نا آشنائے محض ہوتی جا رہی ہے، اسی لیے اس کی تخلیقات اور نتائج مطالعہ و تصنیفات میں گہرائی اور دقت نظر کا دور دور تک پتہ نہیں، بلکہ سطحیت ہی اس کی شناخت بن گئی ہے۔ اس لیے کہ علم و تحقیق کی راہ میں قاضی صاحب ان کے بعض ہم عصر اور ان کے اکثر پیش رو جس طرح "مکابہ" (ناپسندیدہ چیزیں

یعنی: سب و تکالیف کو برداشت کرنے بلکہ انہیں شیریں سمجھنے کے عادی تھے، یہ سخت نسل نویں معدوم ہو گئی ہے اور لگتا ہے کہ ماؤں نے اب سابقہ نسل کے لوگوں کو جتنا چھوڑ دیا ہے۔

فروغ شمع جواب ہے رہے گی رہتی دنیا تک

مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

شمع علم تو جلتی رہے گی، لیکن تشویش کا بات یہ ہے کہ اس پر نثار ہونے والے پروانے اب

ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

علم کے ساتھ ان کے عشق و خلوص کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی کسی کتاب کا ذاتی طور پر نہ تو حقوق طبع محفوظ کرایا نہ ہی معاوضے کی بات کی، نہ رائٹنگ لی، بلکہ خدمتِ علم کے جذبے سے کتابیں لکھیں اور اسی جذبے سے مختلف ناشرین کو ان کی طباعت و اشاعت کی اجازت دے دی۔ یہ اور بات ہے کہ بعض ناشرین نے (جو کہ عموماً نامعقول اور ناخدا ترس ہوتے ہیں) اپنے لیے "حمداً حقوق طبع بحق ناشر محفوظ ہیں" کے ساتھ ان کی کتابیں چھاپیں۔ اس عمومی اجازت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ "حقوق طبع بحق مؤلف محفوظ" والی کتابیں عموماً مؤلف کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد نایاب ہو جاتی ہیں۔ نیز ان کے ورثہ کے آپسی اختلاف کی آماج گاہ بن کر اہل علم کے لیے باعثِ اذیت و افسوس بن جاتی ہیں۔ حکیم الامت حضرت تھانوی کی کوئی کتاب اسی لیے نایاب نہیں ہوتی کہ انہوں نے محض خدمتِ دین و علم و عقیدہ و ملت کی خاطر کتابیں لکھیں اور ہر ایک کو چھاپنے کی عام اجازت دے دی۔

سادگی، تواضع، بے تکلفی، قناعت شعاری، مناساری، شفقت آمیز برتاؤ، نرم خوئی، علمی انہماک، مطالعہ و تصنیف میں محویت، دنیا کی لذتوں اور مادیت کے سحر سے مکمل آزادی اور شہرت سے نفرت وغیرہ قاضی اطہر صاحب مبارک پوری کی شخصیت کے عناصر ترکیبی تھے۔

قاضی صاحب، میانہ قدر، قدرے کشادہ جبین، متوازن الجسم، گندم گول رنگ، گھنی داڑھی والے قوی الحافظ ذہین اور اپنے طے پہلنے والوں کو بہت دنوں تک یاد رکھنے والے آدمی تھے۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے شروع ہی میں بینائی کمزور ہو گئی تھی اس لئے بہت پاور کاموٹے شیشے والا چشمہ استعمال کرتے تھے نہایت خود دار آدمی تھے۔ زندگی اور انسانوں سے بہت پر امید رہا کرتے تھے۔ وقت کے قدر داں تھے، جو ایک سچے خادمِ علم کا ممتاز خاصہ ہوا کرتا ہے۔ دنیوی غموں سے آزاد اور علمی مشاغل کے غلام تھے۔ ترفع اور خود پسندی سے کوئی مناسبت نہ تھی البتہ خود سازی پر ان کی توجہ ہمیشہ مرکوز رہی۔ بہت سے اہل علم و قلم کی طرح اپنی تعریف آپ کرنے کے عادی نہ تھے اور نہ ہی دوسروں کو حقیر یا کم رتبہ سمجھتے تھے۔ دوسروں سے باتِ حجت پر کرتے وقت پرسکون رہتے۔ طلبہ اور اہل علم سے بے حد محبت کرتے اور متکبروں اور انانیت شعاریوں سے زیادہ نفرت کرتے تھے خواہ وہ کسی قدر وقامت کے

ہوں۔

مختصر سوانحی خاکہ

ولادت اور نام و نسب۔

قاضی صاحب کی ولادت ۴ رجب 1334ھ مطابق 7 مئی 1916 کو صبح پانچ بجے مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔ ان کے جد اعلیٰ سلطان نصیر الدین ہمایوں (914ھ - 864ھ - 1508ء - 556ء) کے عہد سلطنت میں، کٹر مانک پور سے راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد چشتی مانک پوری متوفی 2 شوال 965ھ بانی مبارک پور کے ہم راہ مبارک پور آئے تھے۔ قاضی صاحب کے خاندان میں اسی زمانے سے نیابت قضا کا عہدہ چلا آ رہا تھا۔ اسی مناسبت سے انہیں اور ان کے تمام اہل خاندان کو قاضی کے سہیتے کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

قاضی صاحب کے نانا مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری متوفی 26 رجب 1359ھ نے ان کا نام "عبدالحفیظ" رکھا تھا لیکن وہ قلمی علمی دنیا میں قاضی اطہر مبارک پوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔

مولانا عبدالحفیظ قاضی اطہر مبارک پوری بن شیخ حاجی محمد حسن بن شیخ حاجی لعل محمد بن شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بن شیخ امام بخش بن شیخ علی۔
ان کے والد شیخ حاجی محمد حسن نے 11 ربیع الاول 1398ھ میں وفات پائی۔

پس ماند گان

قاضی صاحب نے اپنے چچے اہلیہ محترمہ (خدا صحت کے ساتھ انہیں عمر دراز بخشے) کے علاوہ چار صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں چھوڑی ہیں۔ ماشاء اللہ سبھی صاحب اولاد ہیں۔
سب سے بڑے لڑکے مولانا خالد کمال صاحب دارالعلوم دیوبند اور مدینہ یونیورسٹی کے فاضل ہیں۔ اس وقت سعودی عرب کی وزارت امور مذہبی کی طرف سے گھانا میں برسر تدریس و دعوت ہیں۔ دوسرے لڑکے مولانا حاجی فخر مسعود صاحب جامعہ مفتاح العلوم منو کے سنیافتہ ہیں۔ اپنے وطن مبارک پور میں کاروبار میں مشغول ہیں تیسرے لڑکے مولانا سلمان مبشر صاحب دارالعلوم دیوبند اور مدینہ یونیورسٹی کے فارغ ہیں۔ پہلے گھانا میں تدریس و دعوت میں سرگرم عمل رہے۔ اب مدرستہ المساکین، بہادر گنج، ضلع غازی پور میں مدرس ہیں۔ چوتھے لڑکے قاضی احسان احمد صاحب، شبلی کالج اعظم گڑھ کے ڈگری ہولڈر ہیں اور مبارک پوری میں ایس ایم ایف اسکول چلا رہے ہیں۔

صاحب زادیوں میں بڑی صاحب زادی "ام سلمہ" اپنے شریک حیات جناب ماسٹر مصباح الدین

کے ساتھ فیروز آباد میں رہائش پذیر ہیں جہاں ماسٹر صاحب انٹر کالج میں استاد ہیں۔ جب کہ دوسری صاحب زادی ”شمیمہ“ جناب رضوان احمد ساکن ”نوادہ“ ضلع اعظم گڑھ کو منسوب ہیں۔ رضوان صاحب بھی مدینہ یونیورسٹی کے فیض یافتہ ہیں۔ اس وقت اپنے وطن ہی میں برسر تجارت ہیں۔

حصول تعلیم۔

قاضی صاحب نے قاعدہ بغدادی، ناظرہ قرآن شریف اور اردو وغیرہ کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے بابرکت رواج کے مطابق محلے کے خانگی مکتب میں حاصل کی۔ اس کے بعد جب کہ وہ قرآن پاک کا تیسرا پارہ ناظرہ پڑھ رہے تھے۔ مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخل ہوئے۔ اسی مدرسہ میں قرآن پاک ختم کیا، پھر اردو فارسی کی تعلیم پندرہ سال کی عمر تک بقول ان کے کھیل کود کر حاصل کی۔

صفر 1350ھ سے شعبان 1359ھ کے دوران درس نظامی میں پڑھائے جانے والے تمام علوم و فنون کی تحصیل، مدرسہ احیاء العلوم ہی میں کی۔ البتہ شوال 1358ھ تا شعبان 1359ھ کا ایک سال تعلیمی زمانہ، جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں گذارا جہاں انہوں نے ذرہ حدیث شریف میں مولانا سید فخر الدین احمد متوفی 1392ھ مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی متوفی 1395ھ اور مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی متوفی 1395ھ ایسے اساتذہ یگانہ سے فیض پایا۔ درمیان میں 1354ھ میں بھی انہوں نے جامعہ قاسمیہ میں داخلہ لیا تھا۔ لیکن ناگزیر اسباب کی بنا پر صرف 2 ماہ بعد مبارک پور واپس آگئے تھے۔

مدرسہ احیاء العلوم میں جن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا ان میں قابل ذکر یہ ہیں۔ مولانا مفتی محمد یسین مبارک پوری متوفی 1404ھ مولانا محمد شکر اللہ مبارک پوری متوفی 1361ھ مولانا بشیر احمد مبارک پوری متوفی 1404ھ، مولانا محمد عمر مظاہری مبارک پوری اور ان کے اپنے ماموں، مولانا محمد سبکی رسول پوری متوفی 1387ھ۔

اپنی مختصر خود نوشت سوانح حیات میں انہوں نے مبارک پور اور قرب وجوار میں ان کے زمانے میں موجود، ان علماء اور اہل کمال کے نام گنائے ہیں، جن کے کاموں اور کارناموں کو دیکھ سن کر ان کے اندر علمی حوصلہ بیدار ہوا اور ان سے کسی نہ کسی طرح راہنمائی ملی۔ ان میں سر فہرست ان کے جد محترم مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری متوفی 1359ھ ہیں جو متبحر عالم، مدرس، مصنف، ادیب، طبیب، حاذق اور عربی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ دوسرے مولانا عبدالرحمن مبارک پوری صاحب ”تحفۃ الاحوذی“ متوفی 1353ھ تیسرے مولانا عبدالسلام مبارک پوری مصنف ”سیرۃ البحاری“ متوفی 1343ھ۔

نیز علوم و فنون کی پچاسوں ان اہمات الکتب کے نام بھی لیے ہیں جنہیں انہوں نے عاریتاً خرید کر پڑھیں اور ان کے ذریعے اپنی علمی صلاحیت کو بختہ کیا اور ثقافتی اثاثے کو وسعت دی، جس کے طفیل علمی دنیا میں دھوم مچا دینے والی تصنیفات ان کے قلم سے نکلیں۔

ان کی علمی گروید کی کا یہ عالم تھا کہ طالب علمی کے اولیں دور سے ہی جب کہ وہ عبرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ درسی کتابوں کے علاوہ بہت سی غیر درسی مطبوعات و مخطوطات خریدیں اور جو نایاب تھیں انہیں اپنے قسم سے نقل کر لیں کہ اس زمانے میں آج کی طرح فوٹو اسٹیٹ کی کوئی سہولت نہ تھی۔ انہوں نے اسی مختصر آپ بیتی میں خریدی ہوئی کتابوں کی فہرست اس زمانے میں ان کی قیمتیں اور اکثر کتابوں کی تاریخ خرید نیز نقل کی ہوئی کتابوں کے نام لکھے ہیں۔

انشا اور مضمون نگاری کا ذوق۔

مضمون نگاری کا شوق ان کے اندر اپنے نانا مولانا احمد حسین متوفی 1359 ھ کی صحبت سے پیدا ہوا۔ جن کے ذاتی کتب خانے میں علم و فن کی بے بسا کتابیں کثرت سے موجود تھیں اور انھیں تصنیف و تالیف کا صاف ستھرا مذاق تھا۔ مطالعہ و کتب بینی کے رسیا تھے۔ ان کی فہرست کے کمرے میں ہر چہار جانب کتابیں مطالعہ کے لیے چٹائی پر بکھری رہتی تھیں۔ قاضی صاحب کو بچوں کے لکھنے پڑھنے کا خداداد شوق تھا۔ اس لیے ان کی تربیت اور طریق مطالعہ و تصنیف سے اپنے شوق کو ممیز کیا۔ لیکن باقاعدہ راہنمائی انھوں نے کسی سے حاصل نہیں کی بلکہ اس سلسلے میں صرف ان کے ذوق اور خود اعتمادی نے ان کا حوصلہ بڑھایا وہ فرماتے ہیں کہ۔

"معلومات کی فراہمی، ان کی ترتیب اور اسلوب نگارش وغیرہ میں بچوں کے کسی کی راہنمائی حاصل نہ ہو سکی، اس لیے ایک مضمون کئی کئی بار لکھا اور پھاڑ کر پھینک دیا اور کافی محنت کے بعد میرے ذوق کے مطابق ہوتا ساتھ ہی خیال ہوتا کہ یہ مضمون قابل اشاعت ہوا کہ نہیں؟ مگر جب بغیر کسی حک و اضافے کے چھپ جاتا تو حوصلے میں نئی جان آجاتی اور فوراً دوسرا مضمون تیار کرنے میں لگ جاتا"

انھوں نے اشارہ کیا ہے کہ انہیں مضمون نگار بنانے اور تصنیف و تالیف کے لیے حوصلہ دینے میں مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی متوفی 1395 ھ کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ مراد آباد سے رسالہ "قائد" نکالتے تھے۔ اتفاق سے 1357 ھ میں احیاء العلوم مبارک پور کی جمعیتہ الطلحہ کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے بلانے گئے۔ اس موقع سے مولانا محمد میاں صاحب مرحوم کو عبدالحفیظ قاضی اطہر مبارک پوری شاعر اور مضمون نگار کا تعارف ہوا اور انھوں نے قاضی صاحب کو رسالہ "قائد" میں مضمون لکھنے کی دعوت دی چنانچہ مستقل طور پر رسالہ "قائد" میں ان کے مضامین اور اشعار چھپنے لگے۔ شاعری اور مضمون نگاری کا تسلسل تالیف پر منتج ہوا اور انھوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں پانچ کتابیں لکھ ڈالیں۔ دو عربی میں اور تین اردو میں۔

رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد کے مشاغل۔

از شوال 1359 ھ تا 1364 ھ، 1940ء تا 1944ء مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ اس دوران شباب کمپنی (ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورتی) کے لیے سید جمال الدین افغانی (1254 ھ تا 1314 ھ، 1839ء تا 1897ء) کے دو عربی رسالوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ 27 نومبر 1944ء تا 12 جنوری 1945ء مرکز تنظیم اہل سنت امرتسر سے منسلک رہے۔ اس دوران رد شیعیت و قادیانیت میں مضامین لکھے، لکھوائے اور چھپوائے۔ 13 جنوری 1945ء تا یکم جون 1946ء زمزم کمپنی لمیٹڈ لاہور سے منسلک رہے۔ اس عرصے میں ساڑھے نو سو صفحات میں منتخب التفاسیر مرتب کی۔

قیام لاہور کے دوران قاضی صاحب کے والد صاحب جج کو گئے؛ تو شوال 1366 ھ تا صفر 1367 ھ (یکم اکتوبر 1946ء تا جنوری 1947ء) مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں عارضی مدرسہ کی۔ 17 جنوری 1947ء سے سہ روزہ زمزم روزنامہ ہو گیا تو اس کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط 1396 ھ / 1976ء کے زیر تربیت اس سے وابستہ ہو کر صحافت سیکھی۔ تقسیم ملک سے کچھ دن پہلے دونوں اس ارادے سے اپنے وطن آ گئے کہ ہنگامہ فرد ہونے کے بعد لاہور واپس آجائیں گے۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی کے دراز تر ہو جانے کی وجہ سے ان کے لئے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ 1948ء کے آغاز میں بہرائچ سے ہفتہ روزہ "انصار" نکالا "حکومت کے عتاب کی وجہ سے آٹھ ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔

شوال 1367 ھ تا شعبان 1368 ھ، جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تعلیمی خدمت انجام دی۔

جمعہ 28 ذی الحجہ 1368 ھ نومبر 1949ء کو وہ بمبئی وارد ہوئے جو ان کے علمی سفر کی آخری منزل تھی اور جہاں انھوں نے تیس سال سے زائد مدت تک قیام کر کے اہم علمی، ثقافتی اور صحافتی کارنامے انجام دیے۔

بمبئی میں انھوں نے شروع میں دفتر جمیعتہ علماء صوبہ بمبئی میں افتاء اور دیگر تحریری کام کیے۔ پھر روزنامہ جمہوریت میں نائی مدیر رہے۔

13 فروری 1951ء سے مارچ 1991ء تک یعنی چالیس سال سے زائد مدت تک روزنامہ "انقلاب" میں "جواہر القرآن" اور "احوال و معارف" کے عنوان سے علمی، دینی، سیاسی اور تاریخی مضامین لکھتے رہے۔

1952ء جب انجمن خدام النبی کی طرف سے ماہنامہ اور ہفت روزہ "البلاغ" نکھنا شروع ہوا تو دونوں کی ادارت میں کام کرنے لگے۔ ہفت روزہ "البلاغ" تو کچھ ماہ بعد بند ہو گیا، لیکن ماہنامہ "البلاغ" پچیس سال تک ان کی ادارت میں نکھتا رہا۔

12 نومبر 1960ء سے دس سال تک انجمن اسلام ہائی اسکول میں دینیات و اخلاق کی تعلیم

1951ء میں، بھونڈی میں "مفتاح العلوم" کی بنیادی جوتاموز سرگرم عمل ہے۔

اردو تصانیف۔

(1) عرب و ہند رسالت میں (2) خلافت راشدہ اور ہندوستان (3) خلافت امویہ اور ہندوستان (4) خلافت عباسیہ اور ہندوستان (5) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (6) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (7) مآثر و معارف (8) دیار یورپ میں علم و علماء (9) آثار و اخبار (10) مختصر سوانح ائمہ اربعہ (11) تدوین سیر و مغازی (12) خیر القرون کی درس گاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت (13) خواتین اسلام کی دینی و علمی خدمات (14) معارف القرآن (15) علی و حسین (16) طبقات المجاہد (17) تذکرہ علمائے مبارک پور (18) تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں (19) افادات حسن بصری (20) اسلامی نظام زندگی (21) حج کے بعد (22) مسلمان (23) اسلامی شادی (24) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔

عربی تصنیفات۔

(25) رجال السند و السند (26) العقد الثمین فی فتوح السند و من در فیہا من الصحابۃ و التابعین (27) السند فی عہد العباسین۔

قابل ذکر ہے کہ کتاب نمبر (1) اور نمبر (5) کے ترجمے بھی عربی زبان میں قاہرہ سے چھپ چکے ہیں۔ دونوں ترجمے ایک مصری عالم کے قلم سے ہیں۔
عربی میں تحقیق و تحشیہ۔

(28) جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول للابی الفیض محمد بن محمد بن علی حنفی فارسی (29) تاریخ اسماء الثقات لابن شایہ البغدادی (30) دیوان احمد، جو ان کے نانا مولانا احمد حسین کے عربی اشعار کا مجموعہ ہے۔ قاضی صاحب نے اسے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔
علمی و دینی اسفار۔

قاضی صاحب نے پانچ حج کیے۔ پہلا حج 1375ھ میں، دوسرا 1385ھ میں، تیسرا 1393ھ میں، چوتھا 1397ھ میں، پانچواں 1402ھ میں۔

چوتھے حج 1397ھ 1976ء کے بعد انہوں نے بلاد عرب و افریقہ کا علمی و ثقافتی دورہ کیا۔ وہاں کے ممتاز علماء سے ملے، کتب خانوں سے استفادہ کیا، نادر کتابوں کی معلومات حاصل کی اور عالم اسلام کے ایک معتد بہ حصے کے مسلمانوں کے حالات و مسائل سے قریب سے واقف ہوئے۔ جن ملکوں اور شہروں میں گئے ان کے نام اور اسفار کی تفصیل انہوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھ دی ہے۔

اعزازی نشانات و انعامات۔

مارچ 1984ء میں تنظیم فکر و نظر سکھر کو دعوت پر سندھی ادبی میلے میں شرکت کی۔ اس موقع سے انہیں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق (ش 3 محرم 1409ھ مطابق 17 اگست 1988ء بروز

چہار شنبہ) کے ہاتھوں تنظیم کا اعزازی نشان، سندھ کی روایتی چادر اور ٹوپی دی گئی۔

1400 ھ میں اسلام آباد پاکستان میں منعقدہ تیسری عالمی کانفرنس اور سرکاری سیرت کانفرنس میں مدعو ہوئے اور شرکت کی۔ اس موقع سے جنرل ضیاء الحق مرحوم نے انہیں ایک نہایت قیمتی لیمپ، عمدہ کشمیری مصلیٰ اور ایک محافل شریف تحفے میں دیا۔

اگست 1986ء میں تنظیم فکر و نظر سندھ نے قاضی صاحب کی اپنے ہاں کی پھمپی ہوئی کتابوں کی رسم اجراء میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے، قاضی صاحب کو دعوت دی۔ وزیر اعلیٰ سندھ سید غوث علی شاہ کی صدارت میں، تاج محل ہوٹل کراچی میں ایک شان دار و پر وقار جلسہ ہوا، جس میں چوٹی کے پاکستانی اہل علم و قلم و ادب و ماہرین قانون و ماہرین تعلیم و تربیت نے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔

15 اگست 1984ء کو صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے، عربی زبان اور علمی و تحقیقی کارناموں کے پیش نظر، توفیقین سندھ، کشمیری چادر اور پانچ ہزار روپے نقد سالانہ تاحیات کی پیش کش کی گئی۔ 1998ء میں یہ رقم دس ہزار کر دی گئی تھی۔

وہ ادارے جن کے ممبر یا سرپرست ہے۔

(1) معتمد انجمن تعمیرات ادب مزنگ لاہور، (2) مشیر علمی ادارہ التراث العربی کویت (3) (7) رکن تاسیسی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (8) سرپرست شیخ اسحاق اکیڈمی دارالعلوم دیوبند (9) اعزازی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ (10) اعزازی مدیر ماہنامہ "برہان" دہلی (11) رکن مجلس نوری دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (12) رکن مجلس شوریٰ تاج المساجد بھوپال (13) رکن مجلس شوریٰ جامعہ اشرفیہ نیا بھوپور (بہار)۔

خدا نے پاک انہیں دین علم کی بے بہا خدمت کے طفیل، جنت الفردوس میں جگہ دے اور جوار انبیاء صدیقین و شہداء و صالحین سے نوازے۔ پس ماند گان اور متعارفین اور اہل قربت کو صبر جمیل و اجر جزیل عطا کرے اور ہم سب کو ان کے علم و فضل سے مستفیض کرے اور ان کے بعد کے خلاء کو بہتر طریقے سے پر کرے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

بقیہ ص ۱۷

آزاد اسلامی ریاست کی مقدس فضاؤں میں چار دن گزارنے کے بعد ہم نے واپسی کیلئے رخت سفر باندھا۔ اور یہ سوچتے ہوئے واپس ہوئے کہ ایک بار پھر نسوینی حکومت دلی سر زمین میں داخل ہو رہے ہیں۔

-----یادیں خاک پریشال از کجا برداشتم

اس امید کے ساتھ کہ ایک دن اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پر بھی رحم فرماتے ہوئے اس کو اسلامی خلافت کا گہوارہ بنائے گا۔

کب نظر آجائے گی بیدار سبزے کی بہار

ع-----